© rasailojaraid.com

مولانا محمد طاسین رحمہ اللہ

اصلاحِ معاشرہ کے لیے نبوی حکمتِ عملی

میرے مقالے کا موضوع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کا ایک خاص پہلو ہے۔ جس پر جہاں تک میرے علم کا تعلق ہے، سیرت نگار حضرات نے جیسا اور جتنا لکھنا چاہیے تھا، نہیں لکھا۔ لہٰذا سیرتِ مبارکہ کا یہ پہلو آج ہمارے سامنے ایسا واضح اور اجاگر نہیں جیسے کہ دوسرے بہت سے پہلو واضح ہیں۔ سیرتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس خاص پہلو سے میری مراد وہ حکمتِ عملی ہے جسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اصلاحِ معاشرہ کے سلسلے میں ہمیشہ اپنے سامنے رکھا اور کبھی کوئی ایسا قدم نہیں اٹھایا جو اس کے خلاف ہو۔ اس لیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم تھا کہ آپ اپنے پروردگار کے راستے کی طرف حکمت اور موعظۃ حسنہ کے ساتھ دعوت دیں۔ نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے مقاصد اور آپ کے منصبی فرائض میں سے ایک مقصد اور فرض یہ بھی تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حکمت کی تعلیم دیں اور مسلمانوں کو یہ بتلائیں کہ دین اسلام کو عملاً کامیاب بنانے کے لیے کس طریقے سے کام کریں۔

قرآن حکیم میں فرمایا:

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَجَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ (۱)

''(اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم!) آپ اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور عمدہ وعظ کے ذریعے بلایئے اور ان کے ساتھ بحث پسندیدہ طریقے سے کیجیے۔''

یہ تو ہم سب کو معلوم ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد صرف یہی نہیں تھا کہ آپ اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآن مجید کی شکل میں فکر وعمل کا ایک جامع دستورِ زندگی اور ایک کامل ضابطۂ حیات انسانیت کو دے دیں۔ جس میں اس کی فوز وفلاح اور کامیابی وکامرانی کے لیے ہر قسم کی اصولی ہدایت موجود ہو اور جس کی بنیاد پر ایک ہر لحاظ سے معتدل اور متوازن انسانی معاشرہ وجود میں آسکتا ہو۔ بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ایک بڑا مقصد یہ بھی تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی زندگی میں اپنے ہاتھوں سے قرآنی دستورِ حیات کے مطابق عملاً ایک مثالی معاشرے کی تشکیل بھی فرمائیں تاکہ دنیا پر یہ واضح ہو کہ جس نظامِ حیات کی طرف اس کو دعوت دی جارہی ہے، وہ قابل عمل ہے اور اپنے عملی فوائد وثمرات کے لحاظ سے دوسرے تمام نظام ہائے حیات کے مقابلے میں انسانیت کے لیے زیادہ مفید ہے۔

اسی طرح یہ بھی ہم سب جانتے ہیں کہ جس عرب معاشرے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا ظہور ہوا وہ معاشرہ ہر پہلو سے انتہائی طور پر بگڑا ہوا تھا اور ذہنی اور خارجی طور پر اس مثالی معاشرے سے بالکل مختلف بلکہ متضاد تھا۔ جس کی تشکیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس فرائض میں سے تھی۔

مثلاً وہ مثالی معاشرہ توحید خالص کے انوار سے روشن اور منور تھا اور یہ معاشرہ ہر قسم کے شرک کی تاریکیوں میں پوری طرح مستغرق تھا۔ وہ مثالی معاشرہ ہر قسم کے ظلم وفساد سے پاک اور کامل عدل وانصاف اور احسان وایثار کی برکات سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مالا مال تھا اور یہ معاشرہ اپنے ہر پہلو میں ظلم وفساد کی نحوستیں لیے ہوئے تھا۔ معاشی لحاظ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش نظر مثالی معاشرے میں ربا وقمار اور ان جیسے دوسرے معاشی معاملات کا کوئی وجود نہیں تھا اور اس عرب معاشرے کے تمام معاشی کاروبار ربا اور قمار پر چل رہے تھے۔ اسی طرح معاشرتی لحاظ سے اس مثالی معاشرے میں کامل انسانی مساوات کے ساتھ ساتھ فضیلت وشرافت اور تفوق وبرتری کا معیار صرف تقویٰ تھا۔ رنگ، نسل، نسب، دولت اور منصب وغیرہ کی بنا پر قومی، قبائلی، خاندانی اور شخصی برتری اور تفاخر کے لیے اس میں کوئی گنجائش نہیں تھی اور اس کے برعکس اس عرب معاشرے میں رنگ، نسل اور نسب وغیرہ کی بنیاد پر مختلف قبیلوں، خاندانوں اور اشخاص کے درمیان نہایت مضبوطی کے ساتھ امتیازات موجود تھے اور باہمی تفاخر کا مشغلہ زوروں پر تھا۔ غرض کہ یہ عرب معاشرہ اصولی طور مثالی معاشرے کا بالکل اُلٹ تھا جسے قائم کرنا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش نظر تھا۔ لیکن اس کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس پر مامور تھے کہ اسی عرب معاشرے کو درست کریں اور اس میں درجہ بدرجہ ایسی اصلاحی تبدیلیاں عمل میں لائیں کہ وہ بالآخر مطلوبہ مثالی معاشرہ بن جائے اور ساتھ ہی ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم بھی تھا کہ یہ اصلاح ایسے طریقے سے فرمائیں کہ اصلاحِ معاشرہ سے جو مقصود ہے اُس کو کوئی نقصان نہ پہنچے اور اگر پہنچے تو کم از کم پہنچے۔

اصلاحِ معاشرہ سے مقصود یہ تھا کہ معاشرے کے تمام افراد کو پائیدار اور مسلسل امن واطمینان کی خوش گوار زندگی نصیب ہو، جس کی طلب وخواہش ہر انسان کے اندر پیدائشی اور اضطراری طور پر پائی جاتی ہے اور جسے قرآن مجید نے حیاتِ طیبہ، حیاتِ حسنہ اور عیشۂ راضیہ (۲) وغیرہ سے تعبیر کیا ہے اور اس کے حاصل ہوجانے کو انسانی فوز وفلاح قرار دیا ہے اور یہ مقصود چونکہ اس صورت میں زیادہ بہتر اور محفوظ طور پر حاصل ہوسکتا ہے جب معاشرے میں مطلوبہ تبدیلی انقلابی طریقے سے نہیں بلکہ تدریجی اصلاح کے طریقے سے عمل میں لائی جائے۔ لہٰذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تدریجی اصلاح کا طریقہ اختیار فرمایا اور اس طریقے میں زیادہ وقت لگنا ایک لازمی امر تھا، لہٰذا اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں تقریباً تیئیس سال کا طویل عرصہ لگا اور اس میں اتنا طویل عرصہ اس وجہ سے بھی لگا کہ اس سلسلے میں جو پالیسی اور حکمتِ عملی آپ صلی اللہ علیہ وسلمکے سامنے رہی وہ بجائے خود کافی دیر طلب تھی اور اس کا تقاضا یہ تھا کہ زیادہ وقت لگے جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا کہ اس مقالے میں میرا اصل مقصد اسی حکمت عملی کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے۔

حکمتِ عملی کے بارے میں کتاب وسنت کے مطالعے اور غور وفکر سے جس نتیجے تک میں پہنچ سکا ہوں، وہ یہ ہے کہ معاشرے کی تدریجی اصلاح کے سلسلے میں ایک بنیادی چیز آپ کے سامنے یہ رہی کہ اصلاح جس قدر بھی عمل میں آئے وہ پائیدار اور مستحکم ہو، عارضی اور وقتی نہ ہو، بالفاظِ دیگر منزلِ مقصود تک پہنچنے میں خواہ کتنی ہی زیادہ دیر کیوں نہ لگ جائے اور رفتار خواہ کتنی ہی سست اور آہستہ کیوں نہ ہو لیکن اس راہ میں کبھی کوئی قدم ایسا نہ اٹھے جس کے ردعمل میں دو قدم پیچھے ہٹنا پڑے اور حاصل شدہ فائدے کے مقابلے میں نقصان زیادہ اٹھانا پڑے۔

اسی پائیدار اور مستحکم اصلاح کی خاطر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو حکمتِ عملی اختیار فرمائی وہ یہ تھی کہ معاشرے میں کوئی عملی تبدیلی اُس وقت بروئے کار لائی جائے جب ایک طرف اس تبدیلی کے لیے سازگار ذہنی فضا تیار ہوجائے اور دوسری طرف اس کے موافق اور مناسب خارجی حالات پیدا ہوجائیں کیوں کہ ان دو چیزوں کے بغیر جو اصلاح عمل میں آتی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے۔ وہ عارضی اور وقتی ہوتی ہے اور پائیدار اور مستحکم نہیں ہوتی۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ یہ انسان کی فطرت ہے جو کبھی بدلی نہیں جا سکتی کہ وہ کسی ایسے کام کو خوشی کے ساتھ نہیں کرتا جس کے لیے اس کا ذہن تیار نہ ہو اور یہ کہ جس کام کے لیے انسان کا ذہن تیار نہ ہو وہ کام اگر اس سے زبردستی لیا جائے تو خوف کی وجہ سے وہ اس کو وقتی طور پر تو کر لیتا ہے لیکن اس سے فرار کے راستے اور چور دروازے بھی برابر تلاش کرتا رہتا ہے جونہی کوئی راستہ اور دروازہ اسے نظر آتا ہے وہ بھاگ نکلتا ہے اور پھر جب وہ خارجی دباؤ کم یا ختم ہوتا ہے تو وہ اس کام کے متعلق اور نیز اس شخص یا ادارے کے متعلق جس نے اس سے وہ کام زبردستی لیا ہوتا ہے سخت نفرت اور بے زاری کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اس لیے یہ اس کا ردِّعمل ہوتا ہے اور ردِّعمل میں ہمیشہ شدت اور سختی زیادہ ہوا کرتی ہے۔ لہٰذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انسان کی اس فطرت کے پیشِ نظر معاشرے میں کوئی عملی تبدیلی اُس وقت فرمائی جب اس تبدیلی کے لیے ساز گار ذہنی فضا تیار ہوگئی۔

مثلاً آپ نے شراب، زنا اور سود وغیرہ کے خلاف اُس وقت تک عملی قدم نہیں اٹھایا جب تک اس کے لیے ساز گار ذہنی ماحول تیار نہیں ہو گیا اور یہ قدم بہت بعد میں اس وقت اٹھایا گیا جب بحیثیت مجموعی معاشرے کا ذہن اس کے لیے تیار ہو گیا اور یہ اس لیے کہ ذہن تیار ہونے سے پہلے اگر ان چیزوں کو قانوناً حرام اور ممنوع قرار دے دیا جاتا تو اس کا انجام اور حشر وہی ہوتا جو مثلاً امریکہ میں قانونِ امتناعِ شراب کا ہوا۔

اسی طرح یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ عمل کے نتائج کے ساتھ خارجی حالات کا گہرا تعلق ہوتا ہے۔ چنانچہ جس طرح کے خارجی حالات ہوتے ہیں عمل سے اسی طرح کے نتائج سامنے آتے ہیں، ایک عمل فی نفسہٖ اچھا ہوتا ہے لیکن بعض خاص طرح کے خارجی حالات میں اس سے جو نتائج برآمد ہوتے ہیں وہ بڑے مقصد کے لحاظ سے مضر اور برے ہوتے ہیں۔ اسی طرح ایک برے عمل سے خاص طرح کے خارجی حالات میں ایسے اثرات ونتائج ظاہر ہو جاتے ہیں جو مقصد کے نقطۂ نگاہ سے اچھے اور مفید ہوتے ہیں مثلاً صلح اور جنگ کے عمل کو لیجیے، صلح کا عمل یقیناً ایک اچھا عمل ہے لیکن تاریخ میں اس کی مثالیں بے شمار ہیں کہ خاص طرح کے حالات میں اس کے جو نتائج نکلے وہ ایک فریق اور اس کے اجتماعی مقصد کے حق میں مضر اور نقصان دہ ثابت ہوئے۔ اس کے برخلاف جنگ فطرتاً ایک برا عمل ہے لیکن اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ بسا اوقات خاص طرح کے حالات میں نتائج وعواقب مرتب ہوئے۔ ان سے ایک فریق اور اس کے نصب العین کو فائدہ پہنچا اور وہ اس کے حق میں اچھے اور بہتر ثابت ہوئے اور وہ چھوٹی برائی کو اختیار کر کے بڑی برائی سے محفوظ ہو گیا، بہرحال یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ عمل کے اثرات ونتائج پر خارجی حالات کا ضرور اثر پڑتا ہے۔ لہٰذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اصلاحِ معاشرہ کے سلسلے میں کوئی عملی اقدام فرمانے سے پہلے ہمیشہ اس چیز کو ملحوظ رکھا کہ اس وقت جو خارجی حالات ہیں وہ اس اقدام کے موافق ہیں یا نہیں اور ان حالات میں وہ فائدہ خاطر خواہ اور پائیدار طور پر حاصل سکتا ہے یا نہیں جو اس اقدام سے مقصود ہے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت تک کوئی عملی قدم نہ اٹھاتے جب تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطمینان نہیں ہو جاتا کہ خارجی حالات موافق ہیں اور نتیجہ خاطر خواہ برآمد ہوگا۔

مثال کے طور پر ربا کو لیجیے جہاں تک اس کے حرام ہونے کا تعلق تھا ظلم پر مبنی ہونے کی وجہ سے وہ روزِ اوّل سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حرام تھی لیکن اس کی تحریم کا قانون مدنی زندگی کے آخری دور میں نافذ ہوا، اس سے پہلے مکی زندگی کے پورے دور اور مدنی زندگی کے ابتدائی دور میں اسے قانونی طور پر حرام نہیں ٹھہرایا اور مسلمانوں کو سودی لین دین سے نہیں روکا گیا تو اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ اس وقت مسلمان جماعت کے جو معاشی حالات تھے وہ کمزور اور غیر مستحکم تھے اور وہ اپنی معاشی ضروریات تک کے لیے غیر مسلموں کے ساتھ معاشی روابط قائم رکھنے پر مجبور تھے۔ اگر اس وقت ربا کو قانوناً حرام قرار دے دیا جاتا تو ظاہر ہے کہ غیر مسلموں سے مسلمانوں کے معاشی تعلقات ختم ہو جاتے کیوں کہ اُن کا سارا لین دین اور کاروبار سود پر تھا۔ اس کے نتیجے میں مسلمانوں کی معاشی حالت پر بہت برا اثر پڑتا اور اس سے ان کے اعلیٰ مقصد اور نصب العین کو نقصان پہنچتا۔ لہٰذا اس قانون کو مناسب حالات پیدا ہونے تک ملتوی رکھا گیا۔ چنانچہ آگے چل کر جب مدنی زندگی کے آخری دور میں مسلمانوں کی معاشی حالت مستحکم ہو گئی اور وہ اپنی ضروریات کے لحاظ سے خود کفیل اور خود مکتفی ہوئے اور یہ اندیشہ باقی نہ رہا کہ غیر مسلموں سے معاشی تعلقات منقطع ہوں گے تو نقصان پہنچے گا تو اس وقت سود کی ہر شکل اور سود سے مشابہ تمام معاشی معاملات کو یکسر حرام قرار دے دیا گیا۔

اسی طرح مدنی زندگی کے آخری دور میں جب مسلمان سیاسی طور پر مستحکم اور خود مختار ہو گئے تو غیر مسلموں کے مقابلے میں جو اقدامات عمل میں آئے وہ اگر اس سے پہلے مثلاً مکی زندگی میں ہوتے تو ان سے بجائے فائدہ پہنچنے کے مسلمانوں کو شدید نقصان پہنچتا اور وہ اپنی منزلِ مقصود کے اتنے قریب نہ ہوتے جتنے کے اس وقت قریب تھے، اسی وجہ سے مکی زندگی میں **فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰی يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ط** (۳) پر عمل رہا اور کفار کے انتہائی مظالم کے باوجود اُن سے لڑنے کی نوبت نہیں آئی۔

حضرات! یہ جو کچھ میں نے عرض کیا ہے اس سے گو زیادہ واضح طور پر نہ سہی لیکن اجمالی طور پر وہ حکمت عملی ضرور سامنے آجاتی ہے جسے اصلاحِ معاشرہ کے سلسلے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ ملحوظ و مدنظر رکھا اور ہمیں تعلیم دی کہ ہم بھی اس سلسلے میں ہمیشہ اس حکمتِ عملی کو ملحوظ و مدنظر رکھیں اور اس کے مطابق اپنے معاشرے کی اصلاح کریں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کا یہ پہلو خصوصیت کے ساتھ اُن حضرات کے لیے مستحق توجہ ہے جو اصلاحِ معاشرہ کے مبارک اور ضروری کام میں لگے ہوئے ہیں اور موجودہ معاشرے کو صحیح اسلامی معاشرے میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں اُن پر لازم ہے کہ وہ اس سلسلے میں وہ طرزِ عمل اور طریق کار اختیار کریں جس کی تعلیم ہمیں کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ میں دی گئی ہے۔ اس کے بغیر کبھی کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ کامیابی اس کا نام نہیں کہ ہم جو اسلامی معاشرہ چاہتے ہیں وہ ہماری زندگی میں ہماری آنکھوں کے سامنے عمل میں آجائے بلکہ کامیابی یہ ہے کہ ہم اس میدان میں اس طریقے پر عمل کرتے ہوئے ختم ہو جائیں جو قرآنِ حکیم اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ نے ہمیں بتایا ہے۔

حوالہ جات:

(۱)　النحل: ۱۲۵

(۲)　ملاحظہ کیجیے: النحل: ۹۷، الحاقہ: ۲۱، القارعۃ: ۷

(۳)　البقرہ: ۱۰۹

(مطبوعہ: ''السیرۃ'' کراچی)

© rasailojaraid.com